357

تبصرۂ کتب

اقبال پر تحقیقی مقالے

ڈاکٹر صدیق جاوید

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

مولانا آزاد سبحانی

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

ڈاکٹر حمید یزدانی

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ
کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ
طلسمِ بے خبری کافری و دیں داری
حدیثِ شیخ و برہمن فسون و افسانہ!

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

نام کتاب: اقبال پر تحقیقی مقالے
از: ڈاکٹر صدیق جاوید
ناشر: بزم اقبال، کلب روڈ لاہور
ضخامت: ۲۴۴ صفحات

"سیرت اقبال" (محمد طاہر فاروقی۔ لاہور ۱۹۳۹ء) "اقبال کامل" (عبدالسلام ندوی، اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء) اور "ذکر اقبال" (عبدالمجید سالک۔ لاہور ۱۹۵۵ء) کا شمار دور اول کی اقبال شناسی پر اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ ستر کے عشرے تک، سوانحی لوازمے، اور مباحث پر مشتمل، بعض دیگر کتابیں بھی سامنے آچکی تھیں، مگر حیات اقبال کے سلسلے میں، ایک طویل عرصے تک متذکرہ بالا کتابوں ہی کو اہم ماخذ کی حیثیت حاصل رہی۔ تینوں مصنف اقبال کے معاصر، اور اپنے دور کے ممتاز اقبالی مصنف تھے، چنانچہ "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا" کے تحت، اقبال صدی، (۱۹۷۳ء) اور بعد ازاں ۱۹۷۷ء) کے زمانے تک آنکھیں بند کرکے، انہی بزرگوں کے بیانات سے استناد کیا جاتا رہا۔ اقبال صدی کے آس پاس اقبال کی ایک جامع سوانح عمری کی ضرورت کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اسی زمانے میں اقبال کی شخصیت اور سوانحی پہلوؤں پر بعض مضامین اور کتابیں سامنے آئیں۔ اس فضا کے نتیجے میں حیات اقبال کے بعض کوائف و نکات کی سند و صحت کی بنیاد پر نقد و تنقیح ہونے لگی، پروفیسر محمد صدیق جاوید نے بھی چند تحقیقی مضامین سپرد قلم کیے سوانح اقبال کے ضمن میں بعض واقعات کے حوالے سے انہوں نے اقبال کے سیرت نگاروں کے تسامحات کی طرف متوجہ کیا، اور نسبتاً زیادہ محتاط رویہ اپنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس ضمن میں ان کے مضامین میں "اقبال اور آرنلڈ" اور "اقبال، مسجد قرطبہ میں" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں مضامین پروفیسر صدیق جاوید کے زیر نظر مجموعے میں شامل ہیں۔ اس زمانے میں انہوں نے بعض دیگر مضامین بھی تحریر کیے تھے، جو اس مجموعے میں بوجوہ (؟) شامل

نہیں کیے گئے) صدیق جاوید کی تحقیق، اقبال صدی اور بعد کے زمانے میں بھی جاری رہی۔ انہوں نے متعدد نئے موضوعات پر قلم اٹھایا اور ان کے کئی مضامین بعض وقیع علمی و ادبی جرائد کی زینت بنے۔ زیر نظر مجموعہ، ان کے آٹھ تحقیقی مقالات پر مشتمل ہے۔

۱۹۰۳ء میں اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد، بلوچستان کے زمانۂ ملازمت میں ایک فوجداری مقدمے میں ملوث ہو گئے۔ اقبال سخت پریشان ہوئے اور دیگر تدابیر کے ساتھ، ایک منظوم فریاد لکھ کر دہلی خواجہ حسن نظامی کو بھیجی کہ مزار پر پڑھی جائے۔ بعد ازاں ۱۹۰۵ء میں ولایت جاتے ہوئے "التجائے مسافر" کے عنوان سے ایک اور نظم خواجہ محبوب الٰہی کی نذر کی۔ ڈاکٹر صدیق جاوید مجموعے کے پہلے مضمون میں سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ اقبال ولایت روانگی سے پہلے حضرت فرید گنج شکر یا حضرت داتا صاحب کے مزار پر حاضر ہونے کی بجائے حضرت نظام الدین اولیاء کے آستانہ پر جا کر دعا کرتے ہیں...... علامہ اقبال کے سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ علامہ کی حضرت محبوب الٰہی سے عقیدت کی تحریک کا سراغ لگائے۔" (ص ۵) ــــ یہ سوال اہم ہے، اور اقبال کے نقادوں نے کبھی اس کے اسباب پر غور نہیں کیا۔ مصنف نے اس سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کی ہے ــــ ان کے خیال میں ایک وجہ تو یہ ہے کہ شیخ عطا محمد، فوجداری مقدمے سے بری ہو گئے، اور یہ "حضرت محبوب الٰہی کی نظر عنایت کے طفیل" ممکن ہوا ــــ اقبال نے ان کے حضور، ایک بار "التجائے مسافر" اسی سبب سے پیش کی کہ دوسرے بزرگوں کی نسبت حضرت محبوب الٰہی کہیں زیادہ بلند مقام و مرتبے پر فائز تھے ــــ مگر کیسے؟ صدیق جاوید صاحب ثبوت میں شیخ محمد اکرام مرحوم کا یہ قول پیش کرتے ہیں: "جو اثر و اقتدار انہیں حاصل ہوا، بہت کم بزرگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔" (ص ۱۱) ــــ ہمارے خیال میں یہ دونوں "اسباب" نظام الدین اولیاء سے علامہ کی خصوصی ارادت کا تشفی بخش ثبوت فراہم نہیں کرتے۔ شیخ عطا محمد کی بریت میں دو باتیں اہمیت رکھتی ہیں، جن کی طرف مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کے نام اقبال نے ایک خط میں اشارہ کیا ہے ــــ ایک تو لارڈ کرزن کا رول، دوسرے اقبال کی ذاتی تگ و دو اور بھاگ دوڑ (جس میں بقول اقبال: "...... روپیہ کثیر صرف ہوا")

ہمارے خیال میں حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر اقبال کی حاضری کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اقبال جس ماحول میں پروان چڑھے، اس میں، اور ایک حد تک آج بھی خانقاہیں بقول ڈاکٹر صدیق جاوید "مرجع خلائق تھیں اور" مزارات پر اکثر و بیشتر حاضری ہیں زمانے کا عام

دستور تھا"۔۔۔۔ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ ذہنی و فکری اعتبار سے اقبال، ایک "عبوری دور" سے گزر رہے تھے۔ سفرِ یورپ کے بعد ہی ان کے اندر ذہنی اور فکری پختگی پیدا ہوئی، اور انہوں نے اپنے بعض خیالات سے رجوع کر لیا۔۔۔۔۔ ۱۹۰۳ء میں شیخ عطا محمد کے مقدمے کی وجہ سے اقبال سخت پریشان تھے، تب بھی خود دہلی جا کر مزار پہ حاضری نہیں دی، بس نظم لکھ بھیجی۔ ۱۹۰۵ء میں بھی جب انہوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر "التجائے مسافر" پیش کی تو بطورِ خاص، یہ سفر اختیار نہیں کیا، بلکہ بعد ازاں بھی دہلی جاتے یا وہاں سے گزرتے تو حاضری دیتے اور یہ حاضری صرف حضرت خواجہ محبوب الٰہی کے ساتھ مخصوص نہ ہوتی۔ ڈاکٹر صدیق جاوید کا پیش کردہ اقبال کا ایک اقتباس توجہ طلب ہے۔

"۔۔۔۔ میں جب کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں۔"

اپنی زندگی میں علامہ اقبال بارہا دہلی گئے، لیکن کیا ہر بار وہ بالالتزام حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر حاضر ہوتے؟ شواہد موجود نہیں ۔۔۔۔ پھر جیسا کہ صدیق جاوید صاحب ہی نے بتایا کہ علامہ حضرت داتا گنج بخش اور شاہ محمد غوث کے مزاروں میں اور حضرت سید گل بادشاہ (امرتسر) اور میاں شیر محمد شرقپوری کی خدمت میں بھی حاضری دیتے رہے۔ آخری دور میں تو ان کی عقیدت کا سب سے بڑا مرکز حضرت مجدد الف ثانی تھے۔ جون ۱۹۳۴ء (کے شدید موسم) میں بطورِ خاص سرہند شریف کا سفر کیا (جاوید کو بھی ساتھ لے گئے) اور مزارِ مجدد پہ حاضری دی۔ بتایا کہ "مزار نے میرے دل پر بڑا اثر کیا"۔۔۔۔ "بالِ جبریل" کی نظم "پنجاب کے پیرزادوں سے" اس اعتبار سے اہم ہے کہ "برگِ گل" اور "التجائے مسافر" میں اقبال کے خیالات رسمی اور روایتی نوعیت کے ہیں۔ ("برگِ گل" کو تو انہوں نے "بانگِ درا" میں شامل بھی نہیں کیا۔) مگر یہاں وہ پیر پرستی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ ابتدائی دور کی دو نظمیں ایک طرح کی شخصی فریاد ہیں، مگر "بالِ جبریل" کی مذکورہ نظم میں حضرت شیخ احمد سرہندی سے ارادت و عقیدت میں اجتماعی اور ملّی حوالہ اہمیت رکھتا ہے ۔۔۔۔ یہاں چند اشعار میں جو اختصار و جامعیت اور معنویت و بلاغت ہے، وہ ابتدائی دور کی دونوں نسبتاً طویل نظموں میں نہیں ہے:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی ، جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمئ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

بات طویل ہو گئی ، کہنا یہ تھا کہ صدیق جاوید صاحب نے جو سوال اٹھایا ، وہ اہم ہے ، مگر جواب مطمئن نہیں کرتا ۔ ابھی تحقیقِ مزید کی ضرورت ہے ۔

"علامہ اقبال اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ" میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کی روحانی ، جذباتی اور فکری شخصیت پر ، اور ان کے شعور اور تحت الشعور میں حضرت بلال کی شخصیت کے گہرے اثرات موجود تھے ۔ اسی حوالے سے اقبال نے عشق کی وہ قدر دریافت کی جس نے ان کے فکری نظام کی ترتیب و تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ـــــ مگر اقبال کے بیشتر شارحین نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر علامہ کی نظموں کو حقیقی سیاق و سباق کو سمجھنے اور ان کی معنویت کو اجاگر کرنے سے قاصر رہے ہیں ۔

"بانگِ درا" کی نظم "مرزا غالب" نہ تو محض رسمی خراجِ تحسین ہے اور نہ اس کی نوعیت "تاثراتی" ہے ۔ اس میں اقبال نے کلامِ غالب کی بعض ایسی خوبیوں اور خصوصیات کی طرف اشارے کیے ہیں جو کلامِ غالب کی تحسین و تنقید کے سلسلے میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعد کے ناقدینِ غالب نے انہی خصوصیات کو بالصراحت اپنے تنقیدی مقالوں میں پیش کیا ـــــ اس موقف کا اظہار ڈاکٹر صدیق جاوید نے تیسرے مقالے "تنقیدِ غالب میں اقبال کا حصہ" میں پیش کیا ہے ـــــ آیندہ چار مضامین پروفیسر تھامس ، ڈاکٹر آرنلڈ اور پروفیسر براؤن سے اقبال کے ربط و تعلق ، کسب و اکتساب اور اثر و تاثر اور اس حوالے سے بعض تاریخی مغالطوں کی تصحیح پر مبنی ہے ۔ اس ضمن میں جناب صدیق جاوید صاحب نے جس دقتِ نظر سے تحقیق کی ہے ، وہ سوانحِ اقبال کے طلبہ کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ مگر ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ اگر سید نذیر نیازی کی بیان کردہ تاریخیں غلط ہیں تو سرے سے ان کے بیانات ہی ناقابلِ تسلیم

ہیں۔ اقبال پر پروفیسر آرنلڈ کے اثرات کے ضمن میں فاضل محقق نے ایک جگہ لکھا ہے: "اقبال سنگھ کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ آرنلڈ ہی تھے، جنھوں نے اقبال کو یورپ میں اعلیٰ تعلیم کی ترغیب دی۔" (ص ۴۴) ــــ پھر یہ کہ: "اقبال کے دل میں علم کی جو بے پناہ خواہش تڑپنے لگی تھی، اس کی تکمیل ولایت میں آرنلڈ کے حضور ہی ہو سکتی تھی۔" (ص ۶۶) ــــ اول تو اس ضمن میں اقبال سنگھ کی سند محل نظر ہے۔ دوسرے اقبال کو یورپ جانے کی ترغیب آرنلڈ نے دی اور تکمیل علم انھی کے حضور ہو سکتی تھی تو ۱۹۰۳ء میں وہ کسی امریکی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے خواہش مند کیوں تھے (مکتوب اقبال بنام مسز سٹر شین، مشمولہ لیٹرز اینڈ رائٹنگز آف اقبال، مرتبہ: بشیر احمد ڈار۔ ص ۱۲۱)۔

اس مجموعے کا آخری مضمون، اقبال کی زیارتِ مسجد قرطبہ کے حوالے سے علامہ کے بعض سوانح نگاروں کے دلچسپ مغالطے کی تصحیح سے متعلق ہے۔

بہ حیثیتِ مجموعی یہ تحقیقی مضامین، ذخیرۂ اقبالیات میں ہر سال شامل ہونے والے ان سیکڑوں تحریروں سے مختلف اور منفرد نوعیت کے ہیں، جن کا وجود و عدم برابر ہے۔ ڈاکٹر صدیق جاوید نے نہ صرف موضوعاتِ تحقیق کے انتخاب میں انفرادیت کا ثبوت دیا ہے، بلکہ کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مضامین اپنے موضوعات پر نہ تو حرفِ آخر ہیں اور نہ خاتم، بلکہ تحقیق مزید کا ایک راستہ دکھاتے ہیں۔ کسی مصنف کی یہ خوبی انتہائی قدر و قیمت رکھتی ہے کہ وہ نئے موضوعات پر چند نئے نکات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرے اور یارانِ نکتہ داں کے لیے خامہ فرسائی اور تلاش و تفتیش کا موقع فراہم کرے ــــ ان مضامین کا محرک ڈاکٹر صدیق جاوید کا یہ احساس رہا کہ حیاتِ اقبال کے بعض حقائق اور واقعات روایت و درایت کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں اس لیے ان کی تنقیح کی ضرورت ہے ــــ یہ احساس اقبالیات میں بہت عام نہیں ہے اور اسی لیے یہ مجموعہ اقبالیات میں ایک معتبر اضافہ شمار ہوگا۔

ڈاکٹر صدیق جاوید اپنے موقف کی تائید میں شواہد جمع کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں مگر اُن کی پیش کش کا انداز داستان سرائی کا ہوتا ہے۔ وہ اسے برادرانہ شکوہ سمجھیں یا ایک مخلصانہ تجویز ــــ کہ حکایتِ لذیذ، حشو و زوائد سے قطع نظر، باختصار و اجمال ہی پیش کریں تو کہیں زیادہ مؤثر و دلچسپ محسوس ہوگی۔

نام مصنف : ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

نام کتاب : "مولانا آزاد سبحانی — تحریکِ آزادی کے ایک متقدر رہنما"

ناشر : ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانشگاہ پنجاب، کلب روڈ لاہور

صفحات : تقریباً ۳۵۰

قیمت : ۸۰/- روپے

ہماری تحریک آزادی کے کئی ایک رہنما ایسے ہیں جن سے خواص تو بخوبی آشنا ہیں لیکن عوام ان کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی کا تعلق ایسے ہی رہنماؤں کی جماعت سے ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ایسے محقق و دانشور نے، جنہیں کچھ عرصہ مولانا مرحوم کے قریب رہنے کا شرف حاصل ہے، مولانا کو پاکستانی عوام سے متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا اور اس ضمن میں ہم تک ایک اچھی کتاب پہنچانے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ یہ بات قابل ذکر اور خوش آئند ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کسی قسم کے صلے سے بے نیاز ہو کر یہ قومی خدمت انجام دی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ایک ذیلی اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ادارے تحقیقاتِ پاکستان (ریسرچ سوسائٹی) نے کتاب زیرِ تبصرہ شائع کر کے جہاں ہماری تحریکِ آزادی کے ایک نمایاں کردار کو گوشۂ گمنامی میں جانے اور کتابِ تحریک کے ایک باب کو ضائع ہونے سے بچایا ہے وہاں مذکورہ تحریک سے دلچسپی رکھنے والوں اور سیاسیات کے طلبہ پر ایک احسان کیا ہے جس کے لیے ادارۂ مذکور لائقِ تحسین و ستائش ہے۔

"مولانا آزاد سبحانی......" پیشِ لفظ کے علاوہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے آخر میں حواشی و تعلیقات دیئے گئے ہیں۔ اشاریے کے بعد اسلام کی تعلیمات سے متعلق مولانا کی انگریزی تحریریں ہیں۔ کتاب کے شروع میں مولانا آزاد کی تصویر بھی دے دی گئی ہے جو ایک اچھا اقدام ہے کہ قدرتی طور پہ انسان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ اس شخصیت کے چہرے مہرے سے بھی شناسا ہو جس کے بارے میں وہ کوئی تحریر پڑھ رہا ہے۔ پیشِ لفظ سے پہلے مولانا کی

IqbalCyberLibrary All rights reserved 2002-2006

ایک عزیزہ جمیلہ خاتون کے حوالے سے مولانا کی شکل وصورت، حلیہ اور قد کاٹھ اور خوش خوراکی و خوش پوشی کا مختصر سا تذکرہ ہے۔ بیش لفظ میں ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کی ترتیب کے پس منظر کا ذکر کیا ہے اور مولانا سے اپنی ملاقاتوں، ان کی قلندرانہ شخصیت، علمی تبحر اور بالخصوص ان کی اولوالعزمی سے بہت متاثر ہونے اور بعض واقعات کی تفصیل دی ہے اور اس طرح یہ حصہ خود ایک اہمیت کا حامل بن گیا ہے۔ بیرون ملک بالخصوص امریکہ وغیرہ میں مولانا کی مذہبی وسیاسی سرگرمیوں اور ان کے توکل علی اللہ کے جذبہ وعمل کی چھوٹی چھوٹی اور دلچسپ قلمی تصویریں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

پہلا باب مولانا کے حالاتِ زندگی کو محیط ہے اور اس میں نام ونسب، ارادہ ماجدہ، ولادت، تعلیم، طب سے لگاؤ، دورانِ تعلیم دیگر مشاغل، استاد کا اثر مولانا کی زندگی پر، سلسلۂ ارادت، تلاشِ معاش، ادبی، سیاسی اور مذہبی سرگرمیاں، مسلم لیگ سے وابستگی، کانگریس سے علیحدگی، تحریکِ خلافت، ترکِ موالات وغیرہ ایسے کئی ذیلی عنوانات کے تحت دستیاب مواد کے مطابق، گویا مولانا کی زندگی کی فلم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے باہم ملا کر ایک پوری دل کش فلم تیار کی گئی ہے۔ ہر ذیلی عنوان چند سطروں پر مشتمل ہے جس سے قاری کسی قسم کی بوریت کا شکار نہیں ہوتا بالکل اس فلم کی طرح جس کا ہر پردہ (ایکٹ) جلدی جلدی بدلتا چلا جاتا ہے اور تماشائی مسلسل سکرین پر نظریں جمائے دیکھتا ہے کہ کسی پردے کا کوئی حصہ اس کی نظروں سے چھوٹ نہ جائے۔

مولانا نے ۱۹۲۵ء میں گورکھپور سے "روحانیت" کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا، جس نے مسلمانوں کی بہت خدمات انجام دیں لیکن اس کی زندگی صرف ڈیڑھ برس رہی۔ بعد میں مولانا نے رسالہ "دعوت" نکالا جس میں وہ مسلمانوں کے الگ وطن کے لیے "اسلامستان در ہمالستان" کے عنوان سے مستقلاً لکھتے رہے۔

فاضل مؤلف نے ایک جگہ مولانا کے انداز تقریر وخطابت پر روشنی ڈالتے ہوئے کتاب "دید وشنید" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "مولانا تقریر بڑی اچھی کرتے ہیں۔ تقریر نہیں کرتے جادو کرتے ہیں۔ بہت بڑے فلسفی بھی ہیں۔ تقریر میں فلسفیانہ تخیل وتجزیے کے کمالات اور دلائل قاطعہ وبراہین ساطعہ کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ مخالف بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں...... یہ شخص اقلیمِ خیال کا بھی فرمانروا تھا اور شہرستانِ زبان کا بھی تاجدار" (ص ۹، ۱۰) فاضل مؤلف کا دعویٰ ہے کہ "مولانا نے تعلیمی اور دینی تبلیغ کے فروغ کے لیے غالباً سب سے پہلے

ہندوستان میں مراسلاتی یونیورسٹی (اوپن یونیورسٹی۔ یزدانی) کا تصور پیش کیا اور عملاً اسے کر دکھایا" (ص ۱۰)۔ مولانا، مسجد مچھلی بازار کانپور کے تنازع میں گرفتار بھی ہوئے۔ اس باب کے آخر میں مولانا کی شاعری، شادی، اولاد اور بیماری و وفات کا ذکر ہے۔ مولانا کی وفات ۱۹۵۷ء میں ۲۳ اور ۲۴ جون کی درمیانی رات ۱ بجے ہوئی۔

دوسرا باب "مولانا آزاد اور تحریک پاکستان" کے عنوان سے ہے۔ فاضل مؤلف نے مولانا کو ان "گنے چنے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں" میں شمار کیا ہے جنھوں نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ پھر مولانا کی سیاسی بصیرت، سیاست میں سرگرمی، مسجد مچھلی بازار کانپور اور مولانا آزاد سبحانی، مسلم لیگ اور مولانا آزاد سبحانی جیسے ذیلی عنوانات کے تحت مولانا کی مختلف سیاسی جماعتوں سے —— کانگریس، جمعیۃ العلمائے ہند وغیرہ —— وابستگی اور علیحدگی کے اسباب وعلل، مولانا کی پرجوش اور ولولہ انگیز تقریروں کے اقتباسات اور دیگر مختلف حوالوں سے اس باب کو آراستہ کیا ہے اور یوں اس حصے کو اس دور کی مختصر اور دلچسپ سیاسی تاریخ کی صورت دے دی ہے۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں مولانا نے گورکھپور میں مختلف پیشہ ور مسلمانوں کو ان کے پیشے کے مطابق متحد اور ان میں اسلامی روح بیدار کرنے کی خاطر "تحریک ربانی" کا آغاز کیا۔ وہ مسلمانوں کو مذہبی اور معاشی اصلاحات کے ذریعے باعمل بنانا اور ان کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کو استوار کرنا چاہتے تھے۔

تیسرا باب مولانا کی اسی قسم کی سرگرمیوں کی تفصیل کو محیط ہے۔ چوتھے باب میں مولانا کی فلسفیانہ حیثیت کا ذکر ہے اور ضرورت فلسفہ سے متعلق نیز علم تنقید کے بارے میں مولانا کے نظریات پیش کیے گئے ہیں۔

اگست ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے ایک حصے کو ڈھا کر حکومت سڑک کشادہ کرنا چاہتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ صورت حال انتہائی ناگوار تھی۔ چنانچہ بے شمار مسلمان مرد، عورتیں اور بچے مذکورہ مسجد میں جمع ہو گئے۔ مولانا نے اس موقع پر ایسی ولولہ انگیز تقریر کی کہ مسلمان جان دینے پر آمادہ ہو گئے۔ مجسٹریٹ نے فائر کھول دیے اور کئی مسلمان مرد، عورتیں اور بچے شہید ہو گئے۔ مولانا کو گرفتار کر لیا گیا۔ پانچویں باب میں "مولانا کی دین داری و دینی خدمات" کے تحت مذکورہ واقعے کی تفصیل ملتی ہے اور یہ باب بھی اس دور کی سیاسی و دینی تاریخ کے

چند اوراق قاری کے سامنے لا کر اس کے لیے دعوتِ فکر و عمل کا سامان کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے مولانا کی طبیعت ایک عجیب کیفیت کی حامل تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ وہ سیماب طبع شخصیت تھے۔ بنیادی طور پر تو وہ مسلمان ہی تھے لیکن مارکس کے مطالعے نے انھیں اس کی ذہنی صلاحیت، انقلابی نقطۂ نظر اور سیاسی فکر وغیرہ سے متاثر کر رکھا تھا۔ تاہم ان کا مارکسزم کسی اور طرز کا تھا۔ وہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو دنیا کے عظیم ترین انقلابی تسلیم کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مارکس کے کمیونزم کا انحصار خدا کے انکار پر ہے جب کہ ان کے کمیونزم کی بنیاد خدا کے اقرار پر ہے۔ چھٹے باب میں، کہ بہت مختصر ہے، مولانا کی زندگی کے اس دلچسپ پہلو کو سمیٹا گیا ہے۔

مولانا آزاد سبحانی نے سیاحت بھی کی۔ ساتواں باب ان کے سفرنامہ کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ یہ سفرنامہ ان کے فرزند حسن سبحانی نے ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ میں لکھنؤ سے شائع کیا۔ اس میں مولانا نے اپنی سیاحت کے اغراض و مقاصد بیان کیے ہیں۔ نیز اہلِ مشرق و مغرب کی زندگی کے مختلف شعبوں میں موازنہ کر کے دونوں کی خوبیاں اور خامیاں گنوائی ہیں۔ جہاں یہ حصہ بھرپور دلچسپی لیے ہوئے ہے وہاں مولانا کے گہرے مشاہدے کی بھی غمازی کرتا ہے۔ یہ باب پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ مولانا نے اس زمانے میں یورپ، امریکہ، فرانس اور چند دیگر ممالک کا سفر کس طرح "توکل علی اللہ" کے تحت کیا اور کس طرح بعض احباب خود بخود اس کا اہتمام کرتے رہے۔ یہ صورتِ حال توکل کے علاوہ مولانا کی اولوالعزمی، ہمت و جوانمردی اور سب سے بڑھ کر قوتِ ارادی کی نشاندہی کرتی ہے۔ کتاب کا یہ باب طویل ترین باب ہے۔

مولانا آزاد سبحانی گویا ایک جامع الحیثیات شخصیت تھے۔ عالم، فلسفی، سیاست دان اور ادیب و شاعر۔ کتاب زیرِ تبصرہ کے آخری باب میں ان کی اس حیثیت سے مختصراً بحث اور ان کے کلام کا کسی قدر انتخاب ہے۔ اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے زیادہ تر غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان اشعار میں عشق و مستی بھی ہے، فلسفہ اور دروں بینی بھی اور خارجیت بھی۔ بعض اشعار بلاشبہ جاذبِ توجہ ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری کو ایک اچھی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ بعض اشعار وزن سے خارج ہیں، لیکن ایسا یقیناً مسوّدے میں سہوِ قلم کے باعث ہوا ہوگا۔

آٹھ ابواب کے بعد اشاریہ ہے اور آخر میں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مولانا کی بعض انگریزی

تحریریں جمع کی گئی ہیں جو سات ابواب کو محیط ہیں ان سے پہلے عبیداللہ عثمان السندی کا "انٹروڈکشن" ہے جس میں انہوں نے مولانا کی ان تحریروں کے مجموعے کو "ہر دو شر" کہا اور مولانا کی متجسس اور نقادانہ طبع کا ذکر کیا ہے۔ ازاں بعد اس کتابچے پر مولانا کا "پریفیس" ہے۔ اس کتابچے میں "اللہ"، "کائنات" اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات کو انوکھے انداز میں لیا گیا ہے۔

کتاب بحیثیت مجموعی بڑی دلچسپ اور ایک دور کی مختصر سیاسی، مذہبی اور معاشرتی جھلکیوں کی حامل ہے۔ فاضل مؤلف کا انداز بیان سادہ و رواں ہے۔ تحریر میں کسی قسم کی گنجلک نہیں ہے کئی ایک حوالوں اور ذاتی انٹرویوز سے انہوں نے کتاب کو مستند اور باوقعت بنانے کی خاصی سعی کی ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قسم کے سیاسی مذہبی رہنماؤں اور ان کے کارناموں کے بارے میں جن سے صرف خاص حلقے آشنا ہیں اور عوام ان سے بڑی حد تک بے خبر ہیں، اسی قسم کی کتابیں تالیف کی جائیں تاکہ یہ قومی ریکارڈ ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔ کتاب پر تبصرہ خوبصورت ڈسٹ کور کے ساتھ اور سفید عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں ہے۔

IQBAL ACADEMY PAKISTAN LIBRARY LAHORE
9-6-97
All rights reserved.